ٹرانڈرتھ روڈ ○ لاہو

تلخیاں

ساحرؔ لدھیانوی

مکتبۂ دستور ○ برانڈرتھ روڈ ○ لاہور

استقلال پریس لاہور سنہ ۱۹۵۸ء قیمت عہ سہ

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

ترتیب

❊ ❊ ❊

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

رِدِّ عمل

چند کلیاں نشاط کی چُن کر
مدّتوں محوِ یاس رہتا ہُوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اُداس رہتا ہوں

ایک واقعہ

اندھیاری رات کے آنگن میں یہ صبح کے قدموں کی آہٹ
یہ بھیگی بھیگی سرد ہوا، یہ ہلکی ہلکی دُھندلاہٹ
گاڑی میں ہُوں تنہا محوِ سفر اور نیند نہیں ہے آنکھوں میں
بھُولے بسرے ارمانوں کے خوابوں کی زمیں ہے آنکھوں میں
اگلے دِن ہاتھ ہلاتے ہیں، پچھلی بپتیں یاد آتی ہیں!
گم گشتہ خوشیاں آنکھوں میں آنسُو بن کر لہراتی ہیں!

سینے کے ویراں گوشوں میں اِک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے
ناکام اُمنگیں روتی ہیں، اُمید سہارے دیتی ہے
وُہ راہیں ذہن میں گھومتی ہیں جن راہوں سے آج آیا ہوں
کِتنی اُمید سے پہنچا تھا، کِتنی مایوسی لایا ہوں

زندگی کو بے نیازِ آرزو کرنا پڑا
آہ کن آنکھوں سے انجامِ تمنّا دیکھئے!

یکسوئی

عہدِ گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو؟
ایک آوارہ منزل کو ستاتی کیوں ہو؟

وہ حسین عہد جو شرمندۂ الفانہ ہوا،
اُس حسیں عہد کا مفہوم بتاتی کیوں ہو؟

زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی،
خرد کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو؟

میں تصوّف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تُم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟

کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج

جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو؟

ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر

خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟

مَیں سمجھتا ہوں تقدّس کو تمدّن کا فریب

تم رسُومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟

جب تمھیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال

پھر مِری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟

تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کر دو

ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

○

شہکار

مصوّر! میں ترا شہ کار واپس کرنے آیا ہوں

اَب اِن رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے

حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے

لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے

نمایاں رنگِ پیشانی پہ عکسِ سوزِ دل کر دے

تبسّم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدہ پن بھر دے

جواں سینے کی مخروطی اُٹھانیں سرنگوں کر دے

گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دے دے

نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دے دے

مگر ہاں بینچ کے بدلے اِسے صوفے پہ بٹھلا دے

یہاں ـــــ میری بجائے اِک چمکتی کار دکھلا دے

غزل

محبّت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اَب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زِندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے

انھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدّت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اَب تو دامنِ دِل چھوڑ دو بے کار اُمّیدو
بہت دُکھ سہہ لیا میں نے بہت دِن جی لیا میں نے

نذرِ کالج

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام
اے وادیٔ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں
تو آج بھی ہے میرے لئے جنّتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال
کمہلائے ہیں یہاں پہ مری زندگی کے پھول
ان راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول

تیری نوازشوں کو بھلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا

تیری نشاط خیز فضائے جواں کی خیر
گلہائے رنگ و بُو کے حسیں کارواں کی خیر

دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسیں فضائیں بسی رہیں

ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے حدِ وطن سے نکل گئے

گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی

سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں
برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں

نغمۂ نشاطِ رُوح کا گایا ہے بارہا
گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا
معصُومیوں کے جُرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل مُوردِ الزام بھی ہوئے
اِس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دُنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم اِن فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

○

غزل

دیکھا تو تھا یُوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے

اے آرزو کے دُھندلے خرابو، جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی، مجھ کو پکار نے

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

مَیں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اَب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوار نے

معذوری

خلوت و جلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مسکرا سکتا نہیں
میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پہ کروں تو گنگنا سکتا نہیں
مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں
روح افزا ہیں جنونِ عشق کے نغمے مگر
اب میں ان گائے ہوئے گیتوں کو گا سکتا نہیں

مَیں نے دیکھا ہے شکستِ سازِ اُلفت کا سماں
اَب کسی تحریک پر بربط اُٹھا سکتا نہیں
دِل تمھاری شدّتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں
تُم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
مَیں تمھارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں
گائے ہیں مَیں نے خلوصِ دل سے بھی اُلفت کے گیت
اب ریاکاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں
کِس طرح تم کو بنا لوں میں شریکِ زندگی
مَیں تو اپنی زندگی کا بار اُٹھا سکتا نہیں
یاس کی تاریکیوں میں ڈُوب جانے دے مجھے
اَب مَیں شمعِ آرزو کی لَو بڑھا سکتا نہیں!

خانہ آبادی

(ایک دوست کی شادی پر)

ترانے گونج اُٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہوا ہے عطر آگیں، ذرّہ ذرّہ مسکراتا ہے
مگر دُور   ایک افسُردہ مکاں میں سر بلبستر پر
کوئی دل ہے کہ ہر آہٹ پہ یونہی چونک جاتا ہے
مری آنکھوں میں آنسُو آگئے نادیدہ آنکھوں کے
مرے دل میں کوئی غمگین نغمہ سرسراتا ہے
یہ رسمِ انقطاعِ عہدِ اُلفت، یہ حیاتِ نَو
محبت رو رہی ہے اور تمدّن مُسکراتا ہے
یہ شادی خانہ آبادی ہو، میرے محترم بھائی
"مُبارک" کہہ نہیں سکتا، میرا دل کانپ جاتا ہے

سرزمینِ یاس

جینے سے دل بیزار ہے
ہر سانس اک آزار ہے

کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

وہ بزمِ احبابِ وطن
وہ ہم نوایانِ سخن

آتے ہیں جس دم یاد اب
کرتے ہیں دل ناشاد اب

گزری ہوئی رنگینیاں
کھوئی ہوئی دلچسپیاں

پہروں رلاتی ہیں مجھے
اکثر ستاتی ہیں مجھے

وہ زمزمے وہ چہچہے
وہ روح افزا قہقہے

جب دل کو موت آئی نہ تھی
یوں بے حسی چھائی نہ تھی

کالج کی رنگیں وادیاں
وہ دل نشیں آبادیاں

وہ نازنینانِ وطن
زہرہ جبینانِ وطن

جن میں سے اک رنگیں قبا
آتش نفس آتش نوا

کر کے محبت آشنا!
رنگِ عقیدت آشنا

میرے دلِ ناکام کو
خوں گشتۂ آلام کو

داغِ جدائی دے گئی
ساری خدائی لے گئی

اِن ساعتوں کی یاد میں
ان راحتوں کی یاد میں

مغموم سا رہتا ہوں میں
غم کی کسک سہتا ہوں میں

سُنتا ہوں جب احباب سے
قصّے غمِ ایّام کے

بے تاب ہو جاتا ہوں میں
آہوں میں کھو جاتا ہوں میں

پھر وہ عزیز و اقربا
جو توڑ کر عہدِ وفا

احباب سے منہ موڑ کر
دُنیا سے رشتہ توڑ کر

حدِّ اُفق سے اُس طرف
رنگِ شفق سے اُس طرف

اک وادیٔ خاموش کی
اِک عالمِ بے ہوش کی

گہرائیوں میں سو گئے
تاریکیوں میں کھو گئے

ان کا تصوّر ناگہاں
لیتا ہے دل میں چُٹکیاں

اور خوں رلاتا ہے مجھے
بے کل بناتا ہے مجھے

وہ گاؤں کی ہمجولیاں
مفلوک دہقاں زادیاں

جو دستِ فرطِ یاس سے		اور یورشِ افلاس سے
عصمت لُٹا کر رہ گئیں		خود کو گنوا کر رہ گئیں
غم گیں جوانی بن گئیں		رُسوا کہانی بن گئیں
ان سے کبھی گلیوں میں اب		ہوتا ہوں میں دوچار جب
نظریں جھکا لیتا ہوں میں		خود کو چھپا لیتا ہوں میں

کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

غزل

خود داریوں کے خول کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے

ہو کر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وُہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

مایوسیوں نے چھین لیئے دل کے ولولے
وُہ بھی نشاطِ رُوح کا ساماں نہ کر سکے

○

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے اُمّید کی لاش
مدّتوں زیست کو ناشاد کیا ہے مَیں نے
تُو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے مَیں نے

جب کبھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے مَیں نے

اور اَب جب کہ مری رُوح کی پہنائی میں!
ایک سُنسان سی مغمُوم گھٹا چھائی ہے
تو دمکتے ہوئے عارض کی شعاعیں لے کر
گُل شُدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے
میری محبُوب، یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا،
میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
مَیں نے جو پھُول چُنے تھے ترے قدموں کے لئے
اُن کا دُھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں
ایک یخ بستہ اُداسی ہے دل و جاں پہ محیط!
اَب مری رُوح میں باقی ہے نہ اُمّید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بارِ سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی اُمنگوں کا خروش

ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا!
بجھ چکے ہیں مرے سینے سے محبت کے کنول
اب ترے حسنِ پشیماں سے مجھے کیا لینا

ترے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگیٔ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محجوب نگاہوں کا پیامِ تجدید
ایک تلافی ہی سہی — میری تمنا تو نہیں

○

غزل

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیٔ مآلِ محبّت نہ پوچھیے!
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو اَب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

اُبھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مِل گئے پھر اتّفاق سے
پُوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیّت کہ آج تک
دُنیا کے ظُلم سہتے رہے خامشی سے ہم

کسی کو اداس دیکھ کر

تمھیں اُداس سا پاتا ہوں مَیں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اُٹھا رہی ہو تُم
وُہ شوخیاں وُہ تبسّم وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تُم
چھُپا چھُپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تُم

مری اُمید اگر مٹ گئی تو مٹنے دو

اُمید کیا ہے بس اک پیش و پس ہے کچھ بھی نہیں

مری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو

غمِ حیات غمِ یک نفس ہے کچھ بھی نہیں

تم اپنے حُسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو

وفا فریب ہے، طولِ ہوس ہے کچھ بھی نہیں

مجھے تمہارے تغافل سے کیوں شکایت ہو؟

مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے!

مَیں جانتا ہُوں کہ دُنیا کا خوف ہے تم کو

مجھے خبر ہے یہ دُنیا عجیب دُنیا ہے

یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے

شکستِ ساز کی آوازِ رُوحِ نغمہ ہے

مجھے تمھاری جدائی کا کوئی رنج نہیں!
مرے خیال کی دُنیا میں، میرے پاس ہو تُم
یہ تُم نے ٹھیک کہا ہے، تمھیں ملا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اُداس ہو تُم
خفا نہ ہونا مری جُرأتِ تخاطُب پر
تمھیں خبر ہے مری زندگی کی آس ہو تُم

مرا تو کچھ بھی نہیں ہے میں رو کے جی لوں گا
مگر خدا کے لئے تم اسیرِ غم نہ رہو،
ہُوا ہی کیا جو زمانے نے تم کو چھین لیا
یہاں پہ کون ہوا ہے کسی کا، سوچو تو
مجھے قسم ہے مری دُکھ بھری جوانی کی
میں خوش ہُوں میری محبت۔ یہ پھول ٹھکرا دو

مَیں اپنی رُوح کی ہر اِک خوشی مٹا لوں گا!
مگر تمھاری مسرّت مٹا نہیں سکتا
مَیں خود کو موت کے ہاتھوں میں سونپ سکتا ہوں
مگر یہ بارِ مصائب اُٹھا نہیں سکتا
تمھارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے مَیں اِک لحظہ پا نہیں سکتا!

یہ اُونچے اُونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھُوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں ہے افلاس اور بھُوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غُل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی رُوح کا نغمہ!

یہ شاہراہوں پہ رنگین ساڑیوں کی جھلک،
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹڑیوں پہ غریبوں کے زرد رُو بچے

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اُٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطہ کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اُداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

غزل

ہوس نصیبِ نظر کو کہیں قرار نہیں
مَیں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مُطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمھارے عہدِ وفا کو مَیں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبّت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیمؔ
وُہ ایک دِل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے، لیکن
میں سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اَب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

○

مرے گیت

مرے سرکش ترانے سُن کے دُنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خونریزی کے افسانوں سے رغبت ہے
مری دُنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے

مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پُرسوز راتوں کو
مَیں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
تصوّر بن کے بھولی واردائیں یاد آتی ہیں
تو سوز و دَرد کی شدّت سے پہروں تلملاتا ہوں
کوئی خوابوں میں خوابیدہ اُمنگوں کو جگاتی ہے
تو اپنی زندگی کو مَوت کے پہلو میں پاتا ہوں

مَیں شاعر ہوں، مجھے فطرت کے نظّاروں سے اُلفت ہے،
مرا دل دشمنِ نغمہ سرائی ہو نہیں سکتا
مجھے اِنسانیت کا دَرد بھی بخشا ہے قُدرت نے
مرا مقصد فقط شُعلہ نوائی ہو نہیں سکتا
جَواں ہُوں مَیں، جوانی لغزشوں کا ایک طوفاں ہے
مری باتوں میں رنگِ پارسائی ہو نہیں سکتا

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے، تو اتنی ہے
کہ جب مَیں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مُفلسوں کو، بے کسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدّد کو، امارت کے تکبّر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو

تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

○

اشعار

ہر چند مری قوّتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبعِ خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہُوں مَیں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دُنیا مرے افکار کی دُنیا نہیں ہوتی

بیگانۂ صفت جادۂ منزل ہی گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارہ نہیں ہوتی

فطرت کی مشیّت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

ایک شام

قمقموں کی زہر اُگلتی روشنی
سنگدل، پرہول دیواروں کے سائے

آہنی بُت، دیو پیکر اجنبی،
چیختی، چنگھاڑتی خونی سرائے

رُوح اُلجھی جارہی ہے، کیا کروں؟

چار جانب ارتعاشِ رنگ و نور
چار جانب اجنبی بانہوں کے جال

چار جانب خوں فشاں پرچم بلند
مَیں، مری غیرت، مرا دست سوال

زندگی شرما رہی ہے، کیا کروں؟

کارگاہ زیست کے ہر موڑ پر!
رُوحِ چنگیزی برافگندہ نقاب

تھام اے صبحِ جہانِ نو کی ضو
جاگ اے مستقبلِ انسان کے خواب

آس ڈوبی جارہی ہے، کیا کروں؟

سوچتا ہوں

سوچتا ہوں کہ محبّت سے کنارا کر لوں
دِل کو بیگانۂ ترغیب و تمنّا کر لوں

سوچتا ہوں کہ محبّت ہے جنونِ رسوا
چند بے کار سے بیہودہ خیالوں کا ہجوم
ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعیٔ موہوم

سوچتا ہوں کہ محبّت ہے سرورِ مستی!
اس کی تنویر سے روشن ہے فضائے ہستی!

سوچتا ہوں کہ محبّت ہے بشر کی فطرت
اس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے
سوچتا ہوں کہ محبّت سے ہے تابندہ حیات
آپ یہ شمع بجھا دینا بہت مشکل ہے

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اِس تمدّن میں مسرّت پہ بڑی شرطیں ہیں

سوچتا ہُوں کہ محبّت ہے اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزّت و ناموس میں کفناتی ہوئی
دَورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رُسوا ہستی
درگہ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی

سوچتا ہوں کہ بشر اور محبّت کا جنوُں
ایسے بوسیدہ تمدّن میں ہے اِک کارِ زبوُں

سوچتا ہُوں کہ محبّت نہ بچے گی زندہ!
پیش ازاں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش
یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ اُلفت ہو کر!
اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش

سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارا کر لوں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنّا کر لوں

موت آ گئی نہ ہو مرے ذوقِ اُمید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں

ناکامی

مَیں نے ہر چند غمِ عشق کو کھونا چاہا
غمِ اُلفت غمِ دُنیا میں سمونا چاہا

وہی افسانے مری سمت رواں ہیں اب تک
وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں اب تک
وہی بے سُود خلش ہے مرے سینے میں ہنوز
وہی بے کار تمنّائیں جواں ہیں اب تک
وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے
وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں اب تک

کثرتِ غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی
میرے بے چین خیالوں کو سکوں مِل نہ سکا
دِل نے دُنیا کے ہر اک درد کو اپنا تو لیا
مُضمحل رُوح کو اندازِ جنوں مِل نہ سکا

میری تخئیل کا شیرازہ بہ ہم ہے وہی
میرے بجھتے ہوئے احساس کا عالم ہے وہی
وہی بے جان ارادے وہی بے رنگ سوال
وہی بے رُوح کشاکش وہی بے چین خیال

آہ اِس کشمکشِ صُبح و مسا کا انجام!
مَیں بھی ناکام، مری سعئِ عمل بھی ناکام!

مجھے سوچنے دے!

میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ
اپنی مایوس اُمنگوں کا فسانہ نہ سُنا
زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سم ہی سہی
درد و آزار سہی، جبر سہی، غم ہی سہی
لیکن اس درد و غم و جبر کی وسعت کو تو دیکھ
ظُلم کی چھاؤں میں دم توڑتی خلقت کو تو دیکھ
اپنی مایوس اُمنگوں کا فسانہ نہ سُنا
میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ

جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ

رہگزاروں پہ فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ

بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں

تیرہ و تار مکاں، مُفلس و بیمار مکیں

نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد

امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد

ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلابِ عظیم

نت نئے طرز پہ ہوتی ہُوئی دُنیا تقسیم

لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں

اور دہقان کے چھپّر میں نہ بتّی نہ دُھواں

یہ فلک بوس ملیں، دِل کش و سیمیں بازار

یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھُوکے بازار

دُور ساحل پہ وُہ شفّاف مکانوں کی قطار
سرسراتے ہوئے پردوں میں سمٹتے گلزار

در و دیوار پہ انوار کا سیلاب رواں
جیسے اِک شاعرِ مدہوش کے خوابوں کا جہاں

یہ سبھی کیوں ہے یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے
کون انساں کا خدا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے

اپنی مایوس اُمنگوں کا فسانہ نہ سُنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ

○

اشعار

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

"حقیقت آشنائی" اصل میں گُم کردہ راہی ہے
عرُوسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

مُبارک ہو ضعیفی کو خِرد کی فلسفہ رائی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

ہوس ہوگی اسیرِ حلقۂ نیک و بدِ عالم
محبّت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمین میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

○

صبحِ نو روز

پھوٹ پڑیں مشرق سے کرنیں

حال بنا ماضی کا فسانہ
گونجا مستقبل کا ترانہ

بھیجے ہیں احباب نے تحفے
اُمڈے پڑے ہیں بزم کے کونے

دُلہن بنی ہوئی ہیں راہیں
جشن مناؤ سالِ نَو کے

نکلی ہے بنگلے کے در سے

اِک مُفلس دہقاں کی بیٹی   افسردہ مرجھائی ہوئی سی

جسم کے دُکھتے جوڑ دباتی   آنچل سے سینے کو چھپاتی

مُٹھّی میں اِک نوٹ دبائے

جشن مناؤ سالِ نو کے

بھوکے، زرد، گداگر بچّے

کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں   وقت سے پہلے جاگ اُٹھے ہیں

پیپ بھری آنکھیں سہلاتے   سر کے پھوڑوں کو کھجلاتے

وہ دیکھو! کچھ اور بھی نکلے

جشن مناؤ سالِ نو کے

○

گریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
اُن آرزوؤں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنھوں نے تیرے تبسّم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جِلا پائی

سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ و دل میں ہے وحشت کی کار فرمائی
وُہ تارے جن میں محبت کا نُور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
سُلا گئی تھیں جنھیں تیری ملتفت نظریں
وُہ درد جاگ اُٹھے پھر سے لے کے انگڑائی
عجیب عالم افسردگی ہے رُو بہ فروغ!
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دِل تمنّائی
تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب
مری اُداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
مَیں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خُود میں چھپالے تری فسوں زائی

مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مِل نہ سکی جنّتِ شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات، بند دریچوں سے بھی گزر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھُپ چھُپ کے نغمہ سرائی
وہ دیکھ سامنے کے پُرشکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی

پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے

سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی

وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی

وہ پھر جھکا کسی دَر پر غرورِ برنائی

وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے

حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی

سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی

اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی

نہیں نہیں، مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ

نہیں نہیں، مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ

شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی

کچھ باتیں

دیس کے ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں

اگلی دُنیا کے فسانے چھوڑ کر
اِس جہنّم زار کی باتیں کریں

ہو چکے اوصاف پردے کے بیاں
شاہدِ بازار کی باتیں کریں!

دہر کے حالات کی باتیں کریں
اس مسلسل رات کی باتیں کریں

من وسلویٰ کا زمانہ جا چکا
بھوک اور آفات کی باتیں کریں

آؤ پرکھیں دین کے اوہام کو
علمِ موجودات کی باتیں کریں

جابر و مجبور کی باتیں کریں
اِس کہن دستور کی باتیں کریں

تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے
فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں

گرنے والے قصر کی توصیف کیا
تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

○

چکلے

یہ کوُچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لُٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظِ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پُر پیچ گلیاں، یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی، یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے، یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

تعفّن سے پُرنیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہُوئی اَدھ کھِلی زرد کلیاں
یہ بِکتی ہُوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وُہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھَن چھَن
تنفّس کی اُلجھن پہ طبلے کی دَھن دَھن
یہ بے رُوح کمروں میں کھانسی کی ٹھَن ٹھَن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ گُونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بیباک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور مدقوق چہرے
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں، جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمّت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

بُلاؤ خُدایانِ دین کو بلاؤ!
یہ کوُچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

○

طرحِ نو

سعیِ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر!
ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر!

بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر!

فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام
سرمایہ کے فریبِ جہاں پروری کی خیر!

طبقات مُتبدل ہیں ہے تنظیم کی نمود
شاہنشہوں کے ضابطۂ خودسری کی خیر!

احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا
پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر!

صحنِ جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں
آقائے ہست و بود کی صنعت گری کی خیر

شعلے لپک رہے ہیں جہنّم کی گود سے
باغِ جناں میں جلوۂ حور و پری کی خیر

انساں اُلٹ رہا ہے رُخِ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر

الحاد کہہ رہا ہے مرتّب جہانِ نَو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

تاج محل

تاج تیرے لئے اِک مظہرِ اُلفت ہی سہی
تُجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
مری محبوب! کہیں اور مِلا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشان
اس پہ اُلفت بھری رُوحوں کا سفر کیا معنی؟

مری محبوب پسِ پردۂ تشہیر وفا!
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
اَن گنت لوگوں نے دُنیا میں محبّت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے
لیکن اُن کے لئے تشہیر کا ساماں نہیں
کیونکہ وُہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مُفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں، یہ حصار
مُطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کُہنہ ناسور
جذب ہے اُن میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

مری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا یہ محل
یہ منقّش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
مری محبوب! کہیں اور مِلا کر مجھ سے

لمحۂ غنیمت

مُسکرا، اے زمینِ تیرہ و تار
سر اُٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق!
دیکھ، وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پُرانے قمار خانے میں!
کُہنہ شاطر بہم اُلجھنے لگے

کوئی تیری طرف نہیں نگراں

یہ گراں بار، سرد زنجیریں

زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی

آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں

فرصتِ یک نفس غنیمت جان!

سر اُٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق!

○

طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اُونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے اُٹھے ہیں بے بس دُکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطُم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے
چوک چوک پر گلی گلی میں سُرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت اُمڈے آتے ہیں

شاہی درباروں کے دَر سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مُہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دُنیا غصب شُدہ حق انسانوں کے
رُسوا بازاری خاتُونیں حقِ نسائی مانگ رہی ہیں —— !
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں !
روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اُٹھی ہے
دُنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اُٹھی ہے
جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکے بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر، ایک بھبکتا شُعلہ ہو کر
کاندھوں پر سنگین کُدالیں، ہونٹوں پر بیباک ترانے
دہقانوں کے دَل نِکلے ہیں، اپنی بگڑی آپ بنانے

آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے

اُبھرے جذبے دب نہ سکیں گے اُکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے

راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رُکے گا

چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رُکے گا

کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دِل جبّاروں کے

بھاگ رہے ہیں ظلِّ الٰہی، مُنہ اُترے ہیں غدّاروں کے

ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضوباری ہے

ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

○

اجنبی محافظ

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں پہ نقاہت کی نمود
خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود
علم کے نور سے عاری ــــ محروم
فلکِ ہند کے افسردہ نجوم

جن کی تخئیل کے پر

چھُو نہیں سکتے ہیں اِس اُونچی پہاڑی کا سِرا

جس پہ ہوٹل کے دریچوں میں کھڑے ہیں تن کر

اجنبی دیس کے مضبُوط گرانڈیل جواں

مُنہ میں سگریٹ لئے ہاتھوں میں برانڈی کے گلاس

جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک

بھُوکے دہقانوں کے ماتھے کا عرق

رات کو جس کے عوض بکتا ہے

کِسی افلاس کی ماری کا تقدّس یعنی

کِسی دوشیزۂ مجبُور کی عصمت کا غرُور

محفلِ عیش کے گونجے ہوُئے ایوانوں میں

اُونچے ہوٹل کے شبستانوں میں

قہقہے مارتے ہنستے ہوئے اِستادہ ہیں

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اسی ہوٹل کے قریب
بھوک کے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اُوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعتِ نایاب کے جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکّہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو
بھوک کے مجبور غلاموں کا گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہُوا اِستادہ ہے

کاش یہ بے حس و بے وقعت و بیدل انساں

روم کے ظُلم کی زندہ تصویر

اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے

ڈیڑھ سو سال کے پابندِ سلاسل کُتّے

اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوّت

کاش یہ اپنے لئے آپ صف آرا ہوتے

اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے

ان کے دل میں ابھی باقی رہتا

قومی غیرت کا وجُود

ان کے سنگین و سیہ سینوں میں

گُل نہ ہوتی ابھی احساس کی شمع

اور یُورپ سے اُمڈتے ہوئے خطرے کے لئے

بیرکرائے کے مُحافظ نہ منگانے پڑتے

ایک منظر

اُفق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مُسکرائے

سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے

پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پُراسرار لَے میں رہٹ گنگنائے

حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے

وہ دُور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصوّر میں لاکھوں دِیے جھلملائے

بُلاوا

دیکھو دُور اُفق کی ضو سے جھانک رہا ہے سُرخ سویرا
جاگو اے مزدُور کسانو!
اُٹھو اے مظلُوم اِنسانو!

دھرتی کے اَن داتا تُم ہو! جگ کے پران ودھاتا تُم ہو
دیہوں کی خوشحالی تُم سے کھیتوں میں ہریالی تُم ہو
اُونچے محل بنائے تُم نے شاہی تخت سجائے تُم نے
ہیرے، لعل نکالے تُم نے نیزے بھالے ڈھالے تُم نے
ہر بگیا کے مالی تُم ہو اِس سنسار کے والی تُم ہو
وقت ہے دھرتی کو اپنا لو آگے بڑھو ہتھیار سنبھالو

اُٹھو اے مظلوم انسانو!

جاگو اے مزدور کسانو!

دیکھو دھرتی کانپ رہی ہے — گرد، پھریرے ڈھانپ رہی ہے

کِشت کی جوالا پھوٹ پڑی ہے — وقت ہے تھوڑا جنگ کڑی ہے

پھیل رہے ہیں کال کے گھیرے — تھامو اپنے سُرخ پھریرے

تم ہو جگ جنتا کے سیوک — پاپ کے ناشک، سَتیہ کے رکھشک

بھوک کے عادی ظُلم کے پالے — کالی کُٹیاؤں کے اُجالے

کیا روکے گی تم کو شاہی — تم ہو بہادر سُرخ سپاہی

جاگو اے مزدور کسانو!

اُٹھو اے مظلوم انسانو!

دیکھو دُور اُفق کی ضَو سے جھانک رہا ہے سُرخ سویرا!

○

شہزادے

ذہن میں عظمتِ اجداد کے قصّے لے کر
اپنے تاریک گھرَوندوں کے خلا میں کھو جاؤ
مرمریں خوابوں کی پریوں سے لپٹ کر سو جاؤ
ابر پاروں پہ چلو، چاند ستاروں میں اُڑو
یہی اجداد سے ورثہ میں ملا ہے تُم کو

دُور مغرب کی فضاؤں میں دہکتی ہوئی آگ
اہلِ سرمایہ کی آویزشِ باہم نہ سہی
جنگِ سرمایہ و محنت ہی سہی
دُور مغرب میں ہے مشرق کی فضاؤں میں تو نہیں
تُم کو مغرب کے بکھیڑوں سے بھلا کیا لینا؟

تیرگی ختم ہوئی، سُرخ شعاعیں پھیلیں

دُور مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے

فتح جمہور کے، انصاف کے، آزادی کے

ساحلِ شرق پہ گیسوں کا دُھواں چھانے لگا

آگ برسانے لگے اجنبی توپوں کے دہن

خواب گاہوں کی چھتیں گرنے لگیں

اپنے بستر سے اُٹھو!

نئے آقاؤں کی تعظیم کرو

اور ــــ پھر اپنے گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ

تُم بہت دیر ــــ بہت دیر تک سوئے رہے

○

شعاعِ فردا

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اُجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اُٹھے گا دلِ گیتی سے دُھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا

اور پھر۔ احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر

اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل

ختم ہو جائے گی انساں کے لہو کی تقطیر

اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم

اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے

نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا

حال، تاریک و سم افشاں سہی۔ لیکن جی لے

○

بنگال

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا؟
کہ ان پہ دیس کی جنتا سِسک سِسک کے مرے

زمیں نے کیا اسی کارن اناج اُگلا تھا؟
کہ نسلِ آدمؑ و حوّا بلک بلک کے مرے

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں؟

کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا؟

کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو!

ملوں کے منتظمو! سلطنت کے فرزندو!

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے

نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے

بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

فنکار

مَیں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں!
آج دُکّان پہ نیلام اُٹھے گا ان کا!
تُو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کی ترازو میں تُلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، میرا احساس

جو تری ذات سے منسوب تھے اُن گیتوں کو
مُفلسی ـــــ جنس بنانے پہ اُتر آئی ہے
بھُوک، تیرے رُخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنّائی ہے
دیکھ اس عرصہ گہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج اِن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
مَیں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

○

کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدّر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ مَیں بیگانۂ الم رہ کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گدازِ بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور مَیں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تُو نہیں، ترا غم، تری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دُکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی رہگزاروں سے
مہیب سائے میری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و مَوت کے پُرہول خارزاروں سے

نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ روشنی کا سُراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
مَیں جانتا ہُوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

○

فرار

اپنے ماضی کے تصوّر سے ہراساں ہُوں مَیں
اپنے گزرے ہوئے ایّام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمنّاؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سُود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلّت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری اُمیدوں کا حاصل، مری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

٭

کتنی بے کار اُمیدوں کا سہارا لے کر
مَیں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمنّاؤں کے مُبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

٭

مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ مَیں نے انھیں چاہا ہی نہیں
اور — وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
مَیں نے ان مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں

مجھ کو کہنے دو کہ مَیں آج جی سکتا ہوں
عشق ناکام سہی، زندگی ناکام نہیں
ان کو اپنانے کی خواہش، انہیں پانے کی طلب
شوقِ بے کار سہی، سعیٔ غم انجام نہیں

وہی گیسو، وہی نظریں، وہی عارض، وہی جسم
مَیں جو چاہوں تو مجھے اَور بھی مِل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی ان کے لئے کِھلنا تھا
ان کی نظروں سے بہت دُور بھی کِھل سکتے ہیں

○

کل اور آج

کل بھی بُوندیں برسی تھیں

کل بھی بادل چھائے تھے

اور کوی نے سوچا تھا ——

بادل یہ آکاش کے سپنے اِن زلفوں کے سائے ہیں

دوشِ ہوا پر مے خانے ہی مے خانے گھِر آئے ہیں

رُت بدلے گی پھول کِھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے

اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے

چرواہے بنسی کی دُھن سے گیت فضا میں بوئیں گے

آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے

پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے

جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکیں گے

اُلجھی اُلجھی راہوں میں وہ آنچل تھامیں آئیں گے

دھرتی، پھول، آکاش، ستارے سپنا سا بن جائیں گے

کل بھی بُوندیں برسی تھیں

کل بھی بادل چھائے تھے

اور کوی نے سوچا تھا —

۲

آج بھی بوندیں برسیں گی

آج بھی بادل چھائے ہیں

اور کوی اس سوچ میں ہے —

بستی پر بادل چھائے ہیں، پر یہ بستی کس کی ہے؟

دھرتی پر امرت برسے گا، لیکن یہ دھرتی کس کی ہے؟

ہل جوتے گی کھیتوں میں الّھڑ ٹولی دہقانوں کی

دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی

فصلیں کاٹ کے محنت کش، غلّے کے ڈھیر لگائیں گے

جاگیروں کے مالک آ کر سب "پونجی" لے جائیں گے

بوڑھے دہقانوں کے گھر، بنیے کی قرقی آئے گی

اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی

آج بھی جنتا بھوکی ہے اور کل بھی جنتا ترسی تھی

آج بھی رم جھم برکھا ہوگی، کل بھی بارش برسی تھی

آج بھی بادل چھائے ہیں

آج بھی بوندیں برسیں گی

—— اور کوئی اس سوچ میں ہے

○

ہراس

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی وُہ ہلکی سی لکیر!
میرے تخئیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے

یُوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کی سرد خموشی میں ہر اک جھونکے سے
ترے انفاس، ترے جسم کی آنچ آتی ہے

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کردوں
لیکن اِن رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اُجالے میں بیاں تو کردوں
اِن حسیں خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگیں شرارت ہی نہ ہو
مَیں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہُوں
وُہ تبسّم وہ تکلّم تری عادت ہی نہ ہو

سوچتا ہُوں کہ تجھے مل کے مَیں جس سوچ میں ہوں
پہلے اِس سوچ کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں
مَیں ترے شہر میں انجان ہوں پردیسی ہوں
تیرے الطاف کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں

کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے تھرا جائیں
اور تری مرمریں باہوں کا سہارا نہ ملے
اشک بہتے رہیں خاموش سیہ راتوں میں
اور ترے ریشمی آنچل کا کنارا نہ ملے

حیات اِک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

اسی دوراہے پر

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اپنی نادار محبت کی شکستوں کے طفیل
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجھلائی تھی

اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حال تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا

پھر، ترے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی
جال بُننے لگی، بُنتی رہی، بُنتی ہی رہی
مَیں کھنچا تجھ سے، مگر تو مری راہوں کے لیے
پھول چُنتی رہی، چُنتی رہی، چنتی ہی رہی

برف برسائی مرے ذہن و تصوّر نے مگر
دِل میں اک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چُپ چاپ نگاہوں کو سُلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھُپا
مَیں اِس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہُوں
تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مفہوم سمجھ سکتا ہُوں

"اب نہ ان اُونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
مَیں نے اِک بار پہلے بھی قسم کھائی تھی!
اِسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پہ
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجھلائی تھی

مجھے معلوم ہے انجام روداِد محبّت کا!
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعیِ رائیگاں کر لوں

ایک تصویرِ رنگ

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حُسن کا نغمۂ جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبۂ بے تاب نظر آئی تھی

اے طرب زارِ جوانی کی پریشاں تتلی!
تُو بھی اِک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تُو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا!

تیرے نازک سے پروں پر یہ زر و سیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
تُو نے راحت کی تمنّا میں جو غم پالا ہے
وُہ تری رُوح کو آباد نہ ہونے دے گا

تُو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لئے
اپنے دِل، اپنی محبّت کا لہو بیچا ہے
دِن کی تزئینِ فسُردہ کا اثاثہ لے کر
شوخ راتوں کی مسرّت کا لہو بیچا ہے

زخم خوردہ ہیں تخیّل کی اُڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری رُوح کے غم پلتے ہیں
سرمگیں آنکھوں میں یُوں حسرتیں لَو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیئے جلتے ہیں

اس سے کیا فائدہ؟ رنگین لبادوں کے تلے
رُوح جلتی رہے، گھُلتی رہے پژمُردہ رہے
ہونٹ ہنستے ہوں دکھاوے کے تبسُّم کے لئے
دل غمِ زیست سے بوجھل رہے، آزُردہ رہے

دِل کی تسکین بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

عُمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری رُوح میں وُسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ جو تری لَے میں مسرّت بھر دے

احساسِ کامراں

اُفقِ رُوس سے پھُوٹی ہے نئی صُبح کی ضَو
شب کا تاریک جگر چاک ہُوا جاتا ہے
تیرگی جتنا سنبھلنے کے لئے رُکتی ہے
سُرخ سیل اَور بھی بے باک ہُوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسا نہ کرے
کُہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں

جذبۂ نصرتِ جمہور کی بڑھتی رو میں
مُلک اَور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں

سنگ و آہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کہو، ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سیلِ انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کہو، چھَٹ جائیں

سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اِک نئی زِیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزمِ آزادیٔ انساں بہ ہزاراں جبروت
اِک نئے دَور کا آغاز کیا چاہتا ہے

بَرتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دُھرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

سُرخ طوفان کی مَوجوں کو جکڑنے کے لئے
کوئی زنجیرِ گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطُم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

○

میرے گیت تمھارے ہیں

اب تک میرے گیتوں میں اُمّید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی، جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں، حال کی بوجھل ظُلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا، اور خوابوں کی شہنائی بھی

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دُوں گا
مدھم، لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دُوں گا

جیون کے اندھیارے پتھ پر مشعل لے کر نکلوں گا

دھرتی کے پھیلے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں

فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بھاگ تمہارے ہیں

جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے

جب تک بے آرام ہو تم، یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے، لوگ مجھے فن کار نہ مانیں

فکر و سخن کے تاجر، میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں

میرا فن، میری امیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں

آج سے میرے گیت تمہارے دُکھ اور سُکھ کا درپن ہیں

تم سے قوّت لے کر، اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا
آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبّت نبھا تو دی

مَیں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ تکلّف، یہ دُکھ، یہ حسرت کیوں
مری نگاہِ طلب آخری نگاہ نہ تھی
حیات زارِ جہاں کی طویل راہوں میں
ہزار دیدۂ حیراں فسوں بکھیریں گے
ہزار چشمِ تمنّا بنے گی دستِ سوال
نکل کے خلوتِ غم سے نظر اُٹھاؤ تو
وُہی شفق ہے، وُہی ضَو ہے مَیں نہیں تو کیا؟

مرے بغیر بھی تم کامیاب عشرت تھیں

مرے بغیر بھی آباد تھے نشاط کدے

مرے بغیر بھی تم نے دیے جلائے ہیں

مرے بغیر بھی دیکھا ہے ظلمتوں کا نزول

مرے نہ ہونے سے اُمید کا زیاں کیوں ہو

بڑھی چلو مئے عشرت کے جام چھلکاتی

تمھاری سیج، تمھارے بدن کے پھولوں پر

اُسی بہار کا پَرتو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ اُداسی، یہ سوگ کیوں آخر

ملیح چہرے پہ گردِ فسردگی کیسی؟

بہارِ غازہ سے عارضِ کو تازگی بخشو!

علیل آنکھوں میں کاجل لگاؤ، رنگ بھرو!

سیاہ جوڑے ہیں کلیوں کی کہکشاں گوندھو

ہزار ہانپتے سینے، ہزار کانپتے لب

تمہاری چشمِ توجہ کے منتظر ہیں ابھی

جِلو میں نغمہ و رنگ و بہار و نور لئے

حیات گرم و تگ و دو ہے، ہیں نہیں تو کیا؟

○

خودکشی سے پہلے

اُف یہ بیدرد سیاہی، یہ ہوا کے نوحے
کس کو معلوم ہے اِس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اِک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دئے
نیلگوں پردوں سے چھنتی ہیں شعاعیں اب تک

اجنبی بانہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ردائیں اب تک

سرد ہوتی ہوئی بتّی کے دھوئیں کے ہمراہ
ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
کون پونچھے مری آنکھوں کے سلگتے آنسو
کون اُلجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے

آہ یہ غارِ ہلاکت، یہ دیئے کا محبس
عمر اپنی اِنھی تاریک مکانوں میں کٹی
زندگی فطرتِ بے حس کی پرانی تقصیر
اِک حقیقت تھی مگر چند فسانوں میں کٹی

کتنی آسائشیں ہنستی رہیں ایوانوں میں
کتنے در میری جوانی پہ سدا بند رہے
کتنے ہاتھوں نے بُنا اطلس و کمخواب مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے

ظلم سہتے ہوئے ۔ انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظلمت ہے فضاؤں پہ ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر

جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر

ابھی روشن —— ہیں ترے گرم شبستاں کے دیئے
آج میں موت کے غاروں میں اُتر جاؤں گا
اور دم توڑتی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ
سرحدِ مرگِ مسلسل سے گزر جاؤں گا

O

پھر وہی کنجِ قفس

چند لمحوں کے لئے شور اُٹھا، ڈوب گیا
کہنہ زنجیرِ غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیلِ بلا ہے، وہی دامِ امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی

ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطّل کا فسوں
نبضِ اُمّیدِ وطن اُبھری، مگر ڈوب گئی

پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پا کر
ڈھتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی

میرے محبوب وطن! تیرے مقدّر کے خدا
دستِ اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تعاقبوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے، وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے، وہی بچّوں کی پکار

ترے رہبر تجھے مرنے کے لئے چھوڑ چلے

ارضِ بنگال! انہیں ڈوبتی سانسوں سے پکار

بول چپ چاپ گاؤں کی مظلوم خموشی کچھ بول

بول اے پریت سے رستے ہوئے سینوں کی بہار

بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں

بول اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار

روک ان لوٹتے قدموں کو، انھیں پوچھ ذرا

پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار

زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک؟

ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک؟

○

اشعار

نفس کے لوچ میں رَم ہی نہیں، کچھ اَور بھی ہے
حیات، ساغرِ سم ہی نہیں، کچھ اَور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نِگاہ میں غم ہی نہیں، کچھ اَور بھی ہے

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گِر
بلند، بامِ حرم ہی نہیں، کچھ اَور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی!

یہ احتیاط، ستم ہی نہیں، کچھ اَور بھی ہے

اِدھر بھی ایک اُچٹتی نظر، کہ دُنیا میں

فروغِ محفل جسم ہی نہیں، کچھ اَور بھی ہے

نئے جہان بسائے ہیں فکرِ آدم نے

اب اِس زمیں پہ اِرم ہی نہیں، کچھ اَور بھی ہے

مرے شعور کو آوارہ کر دیا جس نے

وہ مرگِ شادی و غم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

○

نورجہاںؒ کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں یہ دُخترِ جمہُور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خونریز حقائق سے اُٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے
کیسے مغرُور شہنشاہوں کی تسکین کے لئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے

کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیّش کے لئے

سُرخ محلوّں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے مُنہ بند، مہکتی کلیاں

نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر

اور مُرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں

ظلِّ سُبحان کی اُلفت کے بھرم کی خاطر

کیسے اِک فرد کے ہونٹوں کی ذراسی جنبش

سرد کر سکتی تھی بے لَوث وفاؤں کے چراغ

لُوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ماتھوں کا سہاگ

توڑ سکتی تھی مئے عِشق سے لبریز ایاغ

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد

اِتنا خاموش ہے، فریاد کُناں ہو جیسے

سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
رُوحِ تقدیسِ و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نُور و جہاں گیر نہیں
تُو مجھے چھوڑ کے، ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

○

جاگیر

پھر اُسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
مرے احباب کے سامانِ تعیّش کے لئے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم، حسیں باہنیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے

کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دلآویز اُبلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کساں
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

اُن کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا

اُن کے بازو بھی مرے، قوّتِ بازو بھی مری

مَیں خداوند ہُوں اِس وُسعتِ بے پایاں کا

مَوجِ عارض بھی مری، نکہتِ گیسو بھی مری

مَیں اُن اجداد کا بیٹا ہُوں جنہوں نے پیہم

اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے

غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک

ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پہ رینگنے والے یہ فسُردہ ڈھانچے

ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں!

ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی!
مَیں اِن آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں اِدھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اِس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

زندگی کو بے نیازِ آرزو کرنا پڑا
آہ کن آنکھوں سے انجامِ تمنّا دیکھئے!

مادام

آپ بے وجہ پریشاں سی کیوں ہیں مادام
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میرے ماحول میں انساں نہ رہتے ہوں گے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جلا!
ہم یہاں ہیں، وہاں تہذیب نہیں پل سکتی!

مُفلسی حِسِّ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک، آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں تو لوگوں پہ تعجّب کیسا؟
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزّت کیسی
لوگ کہتے ہیں — مگر آپ ابھی تک چُپ ہیں
آپ بھی کہیئے غریبوں میں شرافت کیسی!

نیک ما دام! بہت جلد وُہ دَور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہوں گے
اپنی ذِلّت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہوں گے

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے، لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل؟
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہو گی!
میں جہاں ہوں، وہاں انسان نہ رہتے ہوں گے

○

یہ کس کا لہو ہے؟

(جہازیوں کی بغاوت۔ فروری ۱۹۴۶ء)

اے رہبرِ ملک و قوم ذرا
آنکھیں تو اُٹھا، نظریں تو مِلا
کچھ ہم بھی سُنیں، ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟

دھرتی کی سُلگتی چھاتی کے بے چین شرارے پُوچھتے ہیں
تم لوگ جنہیں اپنا نہ سکے، وہ خون کے دھارے پُوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چلّاتی ہے، ساگر کے کنارے پُوچھتے ہیں

یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا

اے رہبرِ مُلک و قوم بتا

یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا

وُہ کون سا جذبہ تھا جس سے فرسُودہ نظامِ زیست ملا

جھلسے ہوئے ویراں گلشن میں اک آس امید کا پھُول کھلا

جنتا کا لہو فوجوں سے مِلا، فوجوں کا لہو جنتا سے ملا

اے رہبرِ ملک و قوم بتا

یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا

اے رہبرِ مُلک و قوم بتا

کیا قوم وطن کی جے گا کر مرتے ہوئے راہی غنڈے تھے؟

جو دیش کا پرچم لے کے اُٹھے، وہ شوخ سپاہی غنڈے تھے؟

جو بارِ غلامی سہہ نہ سکے، وُہ مجُرم شاہی غنڈے تھے؟

یہ کِس کا خون ہے کون مرا

اے رہبرِ مُلک و قوم بتا!
یہ کِس کا لہو ہے؟ کون مرا

اے عزمِ فنا دینے والو، پیغامِ بقا دینے والو!
اب آگ سے کتراتے کیوں ہو، شعلوں کو ہوا دینے والو!
طوفان سے اب کیوں ڈرتے ہو، موجوں کو صدا دینے والو!
کیا بھول گئے اپنا نعرا؟

اے رہبرِ مُلک و قوم بتا!
یہ کِس کا لہو ہے؟ کون مرا

سمجھوتے کی اُمّید سہی، سرکار کے وعدے ٹھیک سہی
ہاں مشقِ ستم افسانہ سہی، ہاں پیار کے وعدے ٹھیک سہی
اپنوں کے کلیجے مت چھیدو، اغیار کے وعدے ٹھیک سہی

جمہور سے یوں دامن نہ چھڑا

اے رہبرِ ملک و قوم بتا!
یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو، ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزلِ آزادی کی قسم، ہر منزل پہ دہرائیں گے
یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا!
یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا

○

مفاہمت

نشیبِ ارض پہ ذرّوں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مِل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سِل ہی گئے

جہاد ختم ہُوا ، دورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شرابِ نفس کے پیمانے

یہ جشن، جشنِ مسرّت نہیں، تماشا ہے
نئے لباس میں نِکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوّت بُجھا کے چمکے ہیں!
یہ تیرگی کے اُجالے ہوئے حسیں فانوس

یہ شاخِ نُور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھَلی تو شراروں کے پھُول لائے گی
نہ پھَل سکی تو نئی فصلِ گُل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اِک زہر چھوڑ جائے گی

بمبئی - ۱۵- اگست

"جشنِ آزادی"

آج

ساتھیو! مَیں نے برسوں تمھارے لئے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حُسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
مَیں تمھارا مغنّی، تمھارے لئے
جب کبھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامن چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں!

مَیں تمھارا مغنّی ہوں، نغمہ نہیں ہُوں

اور نغمے کی تخلیق کا ساز و سامان

ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا

اور مَیں — اپنا ٹُوٹا ہُوا ساز تھامے

سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں

میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں

اور انساں کی حیوانیت جاگ اُٹھی ہے

بربریت کے خُونخوار عفریت

اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے

خُون پی پی کے غرّا رہے ہیں

بچّے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں

عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں

ہر طرف شورِ آہ و بُکا ہے

اور مَیں اِس تباہی کے طوفان میں

آگ اور خوں کے ہیجان میں

سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں میں

اپنے نغموں کی جھولی پسارے

در بدر پھر رہا ہوں ——

مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو،

میرے گیتوں کی لَے، میرا سُر، میری نَے

میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو

ساتھیو! مَیں نے برسوں تمھارے لئے

انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے

اجنبی راج کے ظُلم کی چھاؤں میں

سرفروشی کے خوابیدہ جذبے اُبھارے

اور اِس صبح کی راہ دیکھی

جس میں اِس مُلک کی رُوح آزاد ہو

آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس مُلک کے بحر و بر، بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اُگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بیتاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
ان کے خوابوں کو تکمیل کا رُوپ دو
ملک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں، بچیاں ——
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو اُن کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچّوں کو اُن کی خوشی بخش دو

مُلک کی رُوح کو زندگی بخش دو
مجھ کو میرا ہُنر، میری لَے بخش دو
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور مَیں اِس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
دربدر پھر رہا ہُوں

مجھ کو پھر میرا کھویا ہُوا ساز دو
مَیں تمہارا مغنّی ـــــ تمہارے لئے
جب بھی آیا، نئے گیت لاتا رہوں گا

۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء
(اے - آئی - آر) دہلی

غزل

طربِ زارِ دل پہ کیا بیتی، عنبر خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

زمیں نے خوں اُگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

ہمیں یہ فکر کہ اُن کی انجمن کس حال میں ہو گی
اُنھیں یہ غم کہ اُن سے چھوٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو، شبستانوں پہ کیا گزری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خُدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

○

نیا سفر ہے، پرانے چراغ گُل کر دو

فریبِ جنتِ فردا کے جال ٹوٹ گئے
حیات اپنی اُمیدوں پہ شرمسار سی ہے
چمن میں جشنِ ورودِ بہار ہو بھی چکا
مگر نگاہِ گُل و لالہ سوگوار سی ہے

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے
اُفق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہرِ منوّر، کہاں کی تنویریں
کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابنِ آدم نے
خرد گنوا کے، جنوں آزما کے کیا پایا؟
وہی شکستِ تمنّا، وہی غمِ ایّام
نگارِ زیست نے سب کچھ لُٹا کے کیا پایا؟

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریم شاھدِ رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہگذر ختم ہو گئی —— لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پرانے راہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوعِ صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دُلارے اِدھر نہ دیکھیں گے

شکستِ زنداں

چینی شاعر "یانگ سو" کے نام جس نے چیانگ کائی شیک
کی جیل میں لکھا :۔ "بیس۲۰ سال قید
"کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھے ہُوئے چند الفاظ کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ
میں بیس۲۰ سال تک سُورج کی شکل نہ دیکھ سکوں، لیکن کیا یہ تمھارا فرسودہ
نظام جو لمحہ بہ لمحہ بجلی کی تیزی کے ساتھ موت کی طرف بڑھ رہا ہے، بیس۲۰
سال تک زندہ رہ سکے گا؟"

خبر نہیں کہ بلاخانۂ سلاسل میں تری حیاتِ ستم آشنا پہ کیا گزری
خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری
مگر وُہ دیکھ فضا میں غبار سا اُٹھا
وہ تیرے سُرخ جوانوں کے راہوار آئے
نظر اُٹھا کہ وُہ تیرے وطن کے محنت کش
گلے سے کہنہ غلامی کا طوق اتار آئے

افق پہ صبحِ بہاراں کی آمد آمد ہے   فضا میں سُرخ پھریروں کے پھول کھلتے ہیں
زمین خندہ بلب ہے شفیق ماں کی طرح   کہ اس کی گود میں بچھڑے رفیق ملتے ہیں

شکستِ محبس و زنداں کا وقت آ پہنچا
وہ تیرے خواب حقیقت میں ڈھل آئے ہیں
نظر اُٹھا کہ ترے دیس کی فضاؤں میں
نئی بہار نئی جنتوں کے سائے میں

دریدہ تن ہے وہ محلِ سیم و زر جس کو   بہت سنبھال کے لائے تھے شاطرانِ کہن
رباب چھیڑ غزل خواں ہو رقص فرما ہو   کہ جشنِ نصرتِ محنت ہے جشنِ نصرتِ فن

مَیں تجھ سے دور سہی لیکن اے رفیق مرے
تری وفا کو مری جہدِ مستقل کا سلام
ترے وطن کو تری ارضِ باحمیّت کو
دھڑکتے کھولتے ہندوستاں کے دل کا سلام

آہنگِ انقلاب

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں، آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں ـــــ سرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں
پھر ایک منزلِ خونبار کی طرف ہیں رواں
وہ رہنما جو کبھی بار راہ بھولے ہیں
بلند دعویٔ جمہوریت کے پردے میں
فروغِ مجلس و زنداں ہے، تازیانے ہیں
بنامِ امن ہیں جنگ و جدل کے منصوبے
بہ شورِ عدل، تفاوت کے کارخانے ہیں
دلوں پہ خوف کے پہرے، لبوں پہ قفلِ سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

مگر مٹے ہیں کہیں جبر اور تشدّد سے
وُہ فلسفے کہ جلا دے گئے دماغوں کو
کوئی سپاہِ ستم پیشہ چُور کر نہ سکی
بشر کی جاگی ہوئی رُوح کے ایاغوں کو
قدم قدم پہ لہو نذر دے رہی ہے حیات   سپاہیوں سے الجھتے ہوئے چراغوں کو
رواں ہے قافلۂ ارتقائے انسانی
نظامِ آتش و آہن کا دل ہلائے ہوئے
بغاوتوں کے دُہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے
تمام ارضِ جہاں کھولتا سمندر ہے   تمام کوہ و بیاباں ہیں تلملائے ہوئے
مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار کون روکے گا؟

فصیلِ آتش و آہن بہت بلند سہی

بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا

نئے خیال کی پرواز روکنے والو   نئے عوام کی تلوار کون روکے گا

پناہ دیتا ہے جن محبسوں کو تیرہ نظام

وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں

اُبھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم

کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں

ہزار برق گرے ، لاکھ آندھیاں اُٹھیں

وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

○

مُضمحل خواب

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پُوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

چار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں
عُمر بھر کے لیے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گرانبار ہوئی جاتی ہے

میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی، کبھی غیر نظر آئی ہے
کبھی اخلاص کی صورت، کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تُو نے خود اپنے تبسّم سے جگایا ہے جنھیں
اُن تمنّاؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تُو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں

تو کہیں بھی ہو، ترے پھول سے عارض کی قسم
تری پلکیں مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں!

تیرے ہاتھوں کی حرارت ترے سانسوں کی مہک
تیرتی رہتی ہے مرے ذہن کی پہنائی میں
ڈھونڈتی رہتی ہیں تخئیل کی بانہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

تیرا الطاف و کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی، حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
تیری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا ایک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے

قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں

دِل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں

دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمنّاؤں کے

مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو

تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں، ویرانے بھی

میرا حاصل، مری تقدیر بتا دے مجھ کو

○

آوازِ آدم

دبے گی کب تلک آوازِ آدم ہم بھی دیکھیں گے
رُکیں گے کب تلک جذباتِ برہم ہم بھی دیکھیں گے

چلو یُوں ہی سہی یہ جورِ پیہم ، ہم بھی دیکھیں گے

درِ زنداں سے دیکھیں ، یا عروجِ دار سے دیکھیں
تمھیں رسوا سرِ بازارِ عالم ، ہم بھی دیکھیں گے

ذرا دم لو مآلِ شوکتِ جم ، ہم بھی دیکھیں گے

بہ زعمِ قوّتِ فولاد و آہن، دیکھ لو تم بھی!
بہ فیضِ جذبۂ ایمانِ مُحکم، ہم بھی دیکھیں گے

جبینِ کج کُلاہی خاک پر خم، ہم بھی دیکھیں گے

مکافاتِ عمل، تاریخ کہنہ کی روایت ہے
کرو گے کب تلک ناوک فراہم، ہم بھی دیکھیں گے

کہاں تک ہے تمہارے ظُلم میں دم، ہم بھی دیکھیں گے

یہ ہنگامِ وداعِ شب ہے، اے ظلمت کے فرزندو
سحر کے دوش پہ گُلنار پرچم، ہم بھی دیکھیں گے

تمہیں بھی دیکھنا ہو گا یہ عالم، ہم بھی دیکھیں گے

(پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی گرفتاری پر)

م، ع سلام پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر آئینہ ادب۔ چوک مینار انارکلی سے شائع کیا